R. N. 2166/57

Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
[illegible]

علی گڑھ - ۲۲ نومبر ۱۹۶۱ء	ایڈیٹر - آل احمد سرور	جلد ۲۰ - شمارہ ۴۳

مصنفہ ملک راج آنند

مترجمہ شریف احمد

ہندوستانی ادب میں نئی سمتیں

پچھلے دو سال سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا برطانوی ہاتھوں سے طاقت منتقل ہو کر ہندوستانی ہاتھوں میں چلے جانے کے بعد ہمارے ادب میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟ اگر اس بارے میں کوئی دیانتدار رہنا چاہے اور گرد و پیش کوئی جارحیت بھی نہ پیدا کرنا چاہے تو اسے اعتراف کرنا ہوگا کہ آزادی کی پوری ایک دہائی میں ادب کے اعلیٰ ترین معیاروں کے پیش نظر ہندوستانی ادبیات میں تخیلی یا نمایاں صلاحیت کی حامل صرف چند تصانیف ہی پیدا ہو سکی ہیں۔

عین ممکن ہے کہ کوئی صاحب پوچھ بیٹھیں کہ ادب کے یہ اعلیٰ ترین معیار کیا ہیں؟ نیز ہندوستان کی چودہ یا اس سے بھی زیادہ مسلّمہ زبانوں کو اچھی طرح جانے اور سمجھے بغیر اُن کے ادب پر کس طرح حکم صادر کیا جا سکتا ہے؟ تو اصطلاح "اعلیٰ ترین معیار" کی ایک ہی معقول تعریف کی جا سکتی ہے ۔۔۔ ایک ادب پارہ اپنے پوشیدہ محرک، اپنی صداقت اور اپنی سلیقگی کے ذریعے کس حد تک اثر آفریں ہو سکتا ہے۔ بے شمار لوگوں کے جذبات میں کس حد تک ہلچل پیدا کر سکتا ہے، اس طرح کہ ان میں اندرونی تبدیلی پیدا ہو، خواہ وہ کتنی بھی کم سہی ۔ دنیاوی وجود کے فرسودہ راستے سے زندگی کی تنقید کی طرف کس حد تک لا سکتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی وہ روحانی تلاش کس حد تک پیدا کر سکتا ہے جو "مقدس نااطمینانی" کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۔ ادب کے ایسے کارنامے جو صداقت اور حقیقت کے نزدیک ہوتے ہیں، وہ صرف اپنی زبان کی حدود میں گھرے نہیں رہتے، بلکہ دوسری زبانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور تقریباً عالمگیر کارنامے بن جاتے ہیں۔

قدیم زمانے میں، ہمارے ملک میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں، جنھیں اس معنی میں عالمی کتابیں کہا جا سکتا ہے۔ اور جدید دور بھی ایسی کتابوں سے خالی نہیں رہا ـــــ مثلاً رابندر ناتھ ٹیگور کی کچھ نظمیں اور ایک یا دو ناول، سرت چندر چٹرجی کے کچھ طویل اور کچھ مختصر افسانوی پارے اور منشی پریم چند کی کچھ کہانیاں ـــ جنھیں تسلیم کیا جا چکا ہے یا جن کا تسلیم کیا جانا لازمی ہوگا۔ دنیا کی فراخ دل زبانوں اور خود ہندوستان کی مختلف زبانوں کے روپ میں جب یہ کتابیں آئیں گی تو یقین ہے کہ ان کے سامعین کا دائرہ اب سے کہیں وسیع ہو جائے گا۔ ہندوستان کے ہم عصر ارباب قلم کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے ملک کی پڑوسی زبانوں یا بیرونی زبانوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کی ہو۔ ان میں اپنی بزرگ نسلوں کے لکھنے والوں کی حسن کارانہ قوت اور گرم جوشی نہیں ہے۔

لیکن اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی قلم کاروں کی اہمیت کو نظر انداز کیا جائے۔ اپنے چھوٹے کینوس کے باوجود بھبوتی بنرجی کا "پاتھیر پنچالی" سرت چٹرجی کے "سری کانت" کے کچھ حصوں کے ساتھ آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ مانک بنرجی کا "پدما کا ملاح" ایک بنیادی کتاب ہے جو اس نسل کے بعد تک زندہ رہے گی۔ تاراشنکر بنرجی کا "کوی" بھی اپنے مصنف کی کدوکاوش کے اپنی بہن زبانوں میں آسانی سے راستہ بنا لے گا۔ اور یہی بات اُردو کی افسانہ نگار عصمت چغتائی کے چند افسانوں کے متعلق اور خاص کر "بوڑھی کاکی" کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ شاید سمترانندن پنت کی کچھ ہندی نظمیں، مہادیوی ورما اور اندرا گروپ کے نوجوان شاعروں کی کچھ نظمیں اگلے دس سال میں

اور زیادہ پڑھی جائیں گی۔ اور اُردو شاعر فیض احمد فیضؔ کی شدید شاعری دنیا کے شعری انتخابات کا ایک جزو بن جائے گی۔ مہاکوی ولاتھول کی آخری نظمیں اتنی ہی اثر آفریں اور جستجو ہو سکتی ہیں جتنی ٹیگور کے آخری دور کی نظمیں۔ جوں ہی جنوبی ہند کی زبانوں کے خلاف تعصب ختم ہوگا، شدتِ جذبات سے عمرانی ہوئی کے۔ ایم۔ باشیر کی نثر کا صحیح مرتبہ پہچانا جائے گا۔ اور بہار کے ہندی ناول نگار رینو کے "میلا آنچل" کی طرح کون جانے ہندوستان کے کس دور افتادہ اور گمنام گوشے میں کونسی ادبی چنگاری کب شعلہ بن کر بھڑک اُٹھے۔

پھر بھی میں یہ کہوں گا کہ تخلیقی افسانوی ادب اور شاعری کی چند ہی کتابیں ہندوستان میں موجودہ نسلوں کی اتنی ترجمانی کرتی ہیں جتنی کارلو لیوی کی "Christ Stopped at Eboli" اٹلی کی، ہالڈر لیکس نیس کی "Independent People" آئس لینڈ کی، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی "Four Quartets" اینگلو سیکسن دنیا کی اور آلبیر کامیو کی "La Peste" فرانس کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادبی اکتساب کی اس کمی کے چند در چند اسباب ہیں۔

پہلا یہ کہ ہندوستان میں برطانوی تسلط کے بعد ملک کی زبانوں کے ارتقا پر قدغنیں عائد کر دی گئیں۔ دیسی زبانوں کے ادیب بُری طرح احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔ البتہ لارڈ میکالے کے میمورنڈم کے بعد جس کی رو سے انگریزی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی، کلکتہ میں انگریز زدہ اور انگریز پرست لوگوں کے خلاف بنگالی، اُردو اور ہندی کے مستشرقین نے بڑی جدوجہد کی۔

ملک کی یونیورسٹیوں میں جس انگریزی کا چلن ہوا وہ King Emperors' English تھی جو تیسرے درجے کے معلم، کلرکوں کو سکھاتے تھے) Kings English نہ تھی جس میں انگریزی ادب کے جواہر پارے چھپے ہوئے ہیں۔ برطانوی دفتری حکومت بیشتر ایسے افراد پر مشتمل تھی جن کا ذوقِ ادب ناشائستہ تھا اور جو معاصر افکار و خیالات کے معیاروں کی نہایت محدود جانکاری رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی مٹی پر مغربی ادبِ عالیہ کا چھینٹا بھی پڑنے نہ پایا۔ بالآخر کچھ ہندوستانی دانشوروں، بالخصوص بنگالیوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے یونیورسٹی نظام سے علیحدہ کر لیا اور اپنی سعی و کاوش سے یورپ کے تہذیبی سرچشموں سے سیراب ہو سکے۔

دوسرا سبب یہ کہ برطانوی حکومت کے نقصان دہ اثرات نے جو سماجی افراتفری پیدا کی، اس کا احساس انھیں پیڑھیوں تک ہوتا رہا۔ ہندوستانی ادیبوں کو وہ یقین حاصل کرنے کے لئے بڑا قلیل وقت نصیب ہوا جو انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتا اور ناکافی ذخیرۂ الفاظ کے خام مواد سے جدید تر ادب کے اچھے نمونے پیدا کراتا۔

ہماری اکثر زبانوں کے الفاظ غالباً غنائی، جذباتی اور شاعرانہ بیانات کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ لیکن ان زبانوں میں ایسے الفاظ کی کمی ہے جن کے ذریعے جدید افکار و خیالات کو آسانی سے بیان کیا جا سکے۔ بھرپور نثر لکھنے کے لئے ایسے الفاظ کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری دیہاتی زندگی کے ارتقاء کی سُست گامی نے بلند بانگ شاعرانہ الفاظ اور لمبی چوڑی تراکیب کا ذخیرہ تو اکٹھا کر دیا ہے، لیکن یہ چیزیں آج کے صنعتی انسان کی تیز اور مختصر زبان کے تقاضے پورا نہیں کرتیں۔ صنعتی طور پر پچھڑے ہوئے علاقوں میں تھامس ہارڈی کی مسجّع اور رنگین نثر اور گالز وردی کی الفاظ کی بہتات اور کئی کئی صفحوں میں پھیلی ہوئی منظر کشی کو آج بھی جرٹ رُوڈ اسٹین، جیمس جوائس، ولیم فاکنر یا ہیمنگ وے جیسے ایجاز رقم ادیبوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ بدیسی حکومت نے جو سماجی افراتفری پیدا کی اور جس کے متعلق اوپر اشارہ کیا گیا، اس سے پرانی قدریں درہم برہم ہو گئیں جیسے ذات پات، خاندان، مذاہب اور طرزِ زندگی۔ ان کی جگہ اگر کسی نے لی تو جدیدیت کی سطحی خواہشات نے۔ ناقص تعلیم پانے والے ہندوستانی دانشوروں کے لئے ایک آنے والا اخبار، سولا ہیٹ، کوٹ، پتلون، ریوالور، بائیسکل، ریلوے، ریسٹورنٹ اور سنیما نئے دیوتا بن گئے جبکہ بحری کسٹم ایکٹ اور دوسرے سیاسی احتسابات کے ذریعے یورپی نشاۃ الثانیہ کی روشنی کو ہندوستان میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر ہندوستان کی پرانی قدروں کے اہم عناصر تو رخصت ہو گئے اور مشینیں در آئیں مغربی تہذیب کی اصل ذہنی قدریں حاصل نہ کی جا سکیں اور نہ ہی دانشور طبقہ انھیں پچا سکا۔ اس طرح آدھا تیتر آدھا بٹیر قسم کا معجون ہو گیا جس میں کسی مخصوص سمت کا احساس باقی نہ رہا۔

چوتھے ان اُلجھے ہوئے حالات میں، خاص کر دوسری عالمگیر جنگ کے دوران اور اس کے بعد "تجارت بازی" کی لہریں اور شامل ہو گئیں جو اکثر امریکہ سے آئی تھیں۔ ان کا زیادہ زور ہالی وُڈ قسم کی فلموں، دل ہلا دینے والے اور رعشہ انگیز ناولوں اور اس قسم کے رومان، جن میں لڑکا لڑکی سے ملتا ہے تھوڑی دیر کے لئے نہیں بلکہ اسے حاصل کر کے چھوڑتا ہے اور اس کے بعد ہمیشہ چین کی بنسری بجاتا ہے، پر تھا۔ افلاس کا مارا سنجیدہ ادب سے محروم ایک عام قاری صرف ردی چلبلی پاکٹ سائز کتابیں خرید سکتا تھا، جو معمولی کہانیوں پر تیار کر کے ہندوستان میں انبار کی شکل میں جمع کر دی گئی تھیں۔ ان گھٹیا کتابوں سے پڑھنے والوں کا ذوق کس طرح ستھرا ہو سکتا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں لکھنے والے بہتیرے اہلِ قلم جو پہلے ہی سے افلاس زدہ ہوتے اور اب قلم کے ہوتے یہ روزی نہ پیدا کر سکتے، دیسی ناشروں کے ہاتھوں بھاڑے کے ٹٹو بن کر رہ گئے۔ یہ دیسی ناشر اپنے امریکی ہم مشربوں کی طرح کثیر الاشاعت اور کثیر الفروخت کتابیں لکھوا کر ہندوستانی عوام کو مہیا کرنے لگے اور امریکی ہم مشربوں کے مانند ہی اپنا شکار دبوچنے لگے۔ یہ حرکت ادب کی صالح اقدار کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوئی۔ ساتھ ہی تعلیم یافتہ طبقہ دیہات سے شہروں کی طرف آتا گیا، اس طرح کتابوں کی مانگ اور بڑھ گئی۔ سنجیدہ کتابوں کے لئے بھی بازار میں جگہ نکل آئی۔ دوسری طرف بہت سے عمدہ صلاحیتیں رکھنے والے قلم کار مجبور ہو کر (باقی صفحہ ۱۱ کالم ۲ پر)

اداریہ

الیکشن اور اُردو

۱۹۶۲ء کا الیکشن قریب آرہا ہے۔ ابھی سے کچھ لوگ یہ آواز بلند کررہے ہیں کہ جو اشخاص یا پارٹیاں اردو کی حمایت نہ کریں انھیں ووٹ نہ دیا جائے۔ یہ بات بظاہر اردو کی ہمدردی میں کہی جاتی ہے۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ اردو کی حمایت کے جو دعوے پارٹیوں یا اشخاص کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ وہ محض زبانی دعوے کیوں ہوتے ہیں اور اردو کی حقیقی خدمت کے کیا ذرائع ہیں۔ الیکشن جمہوریت کے نظام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام کو اپنے نمائندے چننے کا اختیار ہے اور چونکہ مجالس قانون ساز اور حکومتیں انھیں نمائندوں سے چلتی ہیں اس لئے اس طرح حکومت کی پالیسی پر اثر انداز ہونے کا انھیں حق ہے۔ عوام جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ بعض اوقات صرف زبانی وعدوں یا خوشنما الفاظ کو دیکھتے ہیں۔ اور عمل کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہماری رائے میں اردو کو الیکشن کا ایک مسئلہ نہیں بنانا چاہئے۔ وہ تو ایک قومی مسئلہ ہے۔ تمام جمہوری اور غیر مذہبی سیاسی پارٹیاں اس کے حق کو تسلیم کرچکی ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ اپنے وعدے پورے نہیں کرتیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں دوبارہ اردو کے متعلق اپنی پوزیشن کو واضح کریں اور عوام کا فرض یہ ہے کہ ان سے اس پر عمل کرائیں۔ الیکشن کا ایک مسئلہ بنانے سے یہ ہوگا کہ کچھ مخالف پارٹیاں ووٹ حاصل کرنے کے لئے لمبے چوڑے وعدے کریں گی۔ ان کے نمائندوں کی اکثریت یا اقلیت صرف اردو کی حمایت کی وجہ سے نہیں دوسرے قومی مسائل پر ان کی پوزیشن کی بنا پر ہوگی۔ اس لئے اردو صرف مخالف پارٹیوں کے پلیٹ فارم سے وابستہ ہوجائیگی۔ ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اردو کی بقا اور ترقی کو اس پارٹی یا اس پارٹی سے متعلق نہیں کرنا چاہئے بلکہ اردو کے لئے ایک ایسا قومی محاذ بنانا چاہئے کہ تمام اہم سیاسی پارٹیاں اس کے حقوق تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔ اس سلسلے میں کانگریس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ اب تک وہ مرکز اور تقریباً تمام ریاستوں کی حکومت چلاتی رہی ہے۔ اس نے نہ صرف اردو سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ بلکہ کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان عملی اقدامات سے ابھی اردو کی بقا کا پورا انتظام ہوا ہے نہ اس کی ترقی کا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ الیکشن کے وقت اردو کے مسئلے کو بھی ملک کے سامنے لائیں اور اس قومی مسئلے پر سیاسی پارٹیوں سے جواب طلب کریں اور اس بات کا اطمینان کریں کہ وہ اردو کے حقوق کی قرار واقعی حفاظت کریں گی۔ دراصل ہمیں سیاسی پارٹیوں کے معیار اخلاق کو بڑھانا ہے کہ جو وہ کہیں اس پر عمل کریں۔ اگر عوام کا احتساب سخت ہوگا اگر الیکشن کے دوران میں کئے گئے وعدوں پر عمل ہوگا تو اردو کی بقا اور ترقی کی طرف سے بے اطمینانی دور ہوگی۔ الیکشن احتساب کے لئے ہے، جانچنے کے لئے ہے۔ اردو کو کسی سیاسی پارٹی کی شعبدہ بازی سے وابستہ کرنے کا نہیں، یہ اس لئے ہے کہ عوام کے حقیقی جذبات ملک کے سامنے آئیں۔ ان کی ضروریات کی طرف توجہ ہو۔ اس لئے نہیں کہ اردو کا قومی مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ بن جائے۔

آل احمد سرور

بین قومی ادبی سیمینار

میں کسی ازم کا قائل نہیں ہوں سوائے ہیومنزم (انسان دوستی) کے۔ ایک فرانسیسی ادیب کے یہ الفاظ وگیان بھون کے ایک کمرے میں گونجے اور فضا میں پھیل گئے۔ دہلی میں ۱۰ نومبر سے ۱۳ نومبر تک ٹیگور جینتی کے سلسلے میں ایک بین قومی سیمینار ہوا تھا جس کے انتظام کے لئے ہم ساہتیہ اکاڈمی اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے ممنون ہیں۔ یونیسکو نے بھی اس کے اخراجات کے سلسلے میں کچھ امداد کی تھی۔

اس سیمینار میں ہندوستان کی ہر زبان کے ادب کے تین تین نمائندے شریک تھے۔ ان کے علاوہ بیس نمائندے دوسرے ملکوں کے تھے۔ سیلون، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، جاپان، ایران، جمہوریہ متحدہ عربیہ، یوگوسلاویہ، سوویٹ یونین، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، مغربی جرمنی، فرانس، سویڈن، انگلستان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ادیبوں نے شرکت کی۔ ممتاز نمائندوں میں الڈس ہکسلے، مسز انا یا برلن، ابالوف، پرنس پریم، پروفیسر نجیب محمود، ڈاکٹر ناسک، ڈاکٹر نائی برگ، پروفیسر اشٹیلر، اور کلوڈس مقصود قابل ذکر ہیں۔

سیمینار کا افتتاح ۱۰ نومبر کو ساڑھے تین بجے رابندر سنگیت سے ہوا۔ اس گروپ نے ٹیگور کے گیت کو اس خوبی سے گایا کہ نہ سمجھنے والے بھی وجد و کیف کی لہروں میں بہہ گئے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے سیمینار کے پروگرام سے مطلع کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک فصیح و بلیغ تقریر میں ٹیگور کی عظمت پر روشنی ڈالی۔ چار ادیبوں کو نامزد کئے گئے، باہر سے آئے ہوئے مہمانوں نے مختصر تقریروں میں ٹیگور کو خراج عقیدت پیش کیا اور آخر میں رابندر سنگیت کے ایک اور مظاہرے پر یہ افتتاحی اجلاس ختم ہوگیا۔

دوسرے دن دس بجے سے اس سیمینار کا باقاعدہ اجلاس شروع ہوا جس میں ہندوستان کی سولہ زبانوں کے ادیبوں نے اپنی زبان کے ادب پر ٹیگور کے اثرات کو واضح کیا۔ ساہتیہ اکاڈمی دستور کی چودہ زبانوں کے علاوہ سندھی اور انگریزی زبانوں کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ ہندوستانی ادبیات پر ٹیگور کے اثرات واضح کرنے والوں میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر سوکمار سین، ہزاری پرشاد دویدی، ملک راج آنند، پروفیسر گوکاک، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور دوسرے حضرات تھے۔

۱۲ نومبر کو دس بجے سے ایک بجے تک اور تین بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک مقالات پڑھے گئے اور ان پر مختصر بحث بھی ہوئی۔ آلڈس ہکسلے نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے ٹیگور کے تعلیمی افکار اور تجربوں کی اہمیت پر زور دیا۔ ۱۳ نومبر کو سیمینار کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔ جس میں ٹیگور اور دنیا کے ذیل میں بیرونی ملکوں کے نمائندوں نے اپنے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر نجیب محمود، ڈاکٹر نائی برگ، ڈاکٹر کلوڈس مقصود، پروفیسر اشٹیلر، مسز انا یا برلن، پرنس پریم، اجوڈ وڈمار، ڈاکٹر ڈوسن، مسٹر مارٹن، ڈاکٹر کرم سنگھے کے مقالوں میں سے انا یا برلن کا مقالہ ٹیگور اور قومیت کا احساس، پرنس پریم کا مقالہ ٹیگور اور تھائی لینڈ، کلوڈس مقصود کا مقالہ ٹیگور کا جوازہ عربی زبان

۱۳ر کی شام کو سیمینار کا تیسرا حصّہ شروع ہوا۔ جس میں جدید زندگی اور ادب کے عنوان پر مقالے پڑھے گئے۔ اس ذیل میں آندرس بکیسٹ کے مقالے پر خاصی بحث ہوئی۔ بکیسٹ نے شاعر اور پیغمبر کی جو تقسیم کی تھی، اس کو تسلیم کرنے سے بہت سے لوگوں کو انکار تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک سائنس اور صنعت و حرفت پر جو کڑی تنقید بکیسٹ نے کی تھی۔ اس کا پسماندہ ملکوں کے لئے کوئی جواز نہ تھا۔ کچھ لوگوں کو اس میں قنوطیت کی ہلکی لہر ناپسند تھی۔ اس مقالے پر بحث میں ہندوستان اور بیرونی ملکوں کے کئی نمائندوں نے حصّہ لیا۔ اور جواب میں بکیسٹ نے بھی یہ تسلیم کیا کہ بڑے ادب میں شاعر اور پیغمبر ایک ہو جاتے ہیں۔ مگر عام طور پر انہیں اپنی اس تعریف پر اصرار تھا کہ ادیب کا بنیادی کام زندگی کو آئینہ دکھانا ہے۔ اس کے حسن و قبح پر رائے دینا نہیں۔

یہ بحث چودہ نومبر کی دوپہر تک چلتی رہی۔ آخر میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے مقالوں اور تقریروں پر تبصرہ کیا۔ اور ٹیگور کی فکر و فن کی روشنی میں انسان دوستی کے ان خیالات پر زور دیا جو ادب کی جان ہیں اور جن سے انسانیت کو اپنی نجات کا سامان مل سکتا ہے۔

سہ پہر کو کھلے اجلاس میں بیرونی ممالک کے چند نمائندوں کی تقریروں کے علاوہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نائب صدر نے اختتامی تقریر کی۔ اور رابندر سنگیت کے خوش آہنگ نغموں کے ساتھ چار دن کا یہ سیمینار ختم ہوا۔

اس سیمینار کے موقع پر رابندر بھون میں بڑے پیمانے پر ٹیگور کی کتابوں، تصاویر اور دیگر آثار کی نمائش کی گئی۔ ٹیگور کے کئی ڈرامے مختلف زبانوں اور تال کٹورہ کے کھلے تھیٹر میں دکھائے گئے۔ ٹیگور پر ستیہ جیت رائے کی مشہور فلم پیش کی گئی اور نمائندوں کو ٹیگور کی صد سالہ یادگار کے لئے تیار کردہ کتاب کے علاوہ ٹیگور کی تصویروں کا ایک البم اور "آفاقی انسان کی طرف" کے نام سے ایک اور کتاب پیش کی گئی۔

اس سیمینار کے ذریعہ سے ایک طرف ٹیگور کے فکر و فن پر روشنی پڑی، دوسرے ہندوستان کے ادیبوں کو دوسرے ممالک کے ادیبوں سے ملنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع ملا۔ اور تیسرے خصوصی طور پر ہندوستان کی علمی و ادبی سرگرمیاں اور اس کی انسان دوستی اور امن پسندی دنیا پر واضح ہوئی۔ سیمینار کا انتظام مجموعی طور پر بہت اچھا تھا۔

ہندوستان کے ادیبوں میں جو لوگ اس میں شریک ہوئے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

آر۔ کے نارائن، پروفیسر موہن سنگھ، شری دنکر۔ ڈاکٹر چھبیار، پروفیسر نروانے، ملک راج آنند، احتشام حسین، جیالال کول۔ ماما وریکر، امرتا پریتم، بلونت گارگی، بیر بھاست، مکرجی، بھابھانی بھٹاچاریا۔ کاکا کالیلکر۔ اماشنکر جوشی، جنیندر کمار، جے رام داس، دولت رام۔ آل احمد سرور۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ٹیگور کے فکر و فن نے صرف ہندوستان کو ہی نہیں پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں ٹیگور کی صد سالہ یادگار نہ منائی گئی ہو، اور ٹیگور کی تصانیف کے ترجمے یا اُن پر تنقیدیں نہ شائع ہوئی ہوں۔ ٹیگور اور اقبال دونوں کی جگہ عالمی ادب میں محفوظ ہے۔

معاصرین

اردو کا معاملہ پھر التوا میں

پنجاب میں حکومت کی طرف سے دلائی گئی وقتاً فوقتاً توقعات سے یہ ظاہر ہوتا رہا ہے کہ یہاں اردو کے لئے ماحول سازگار ہو رہا ہے اور عنقریب سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن یہاں الٹی گنگا بہہ رہی ہے اور اس وقت حالت یہ ہے کہ اس کو جاری کرنے کا چرچا بھی نہیں ہے۔ آخر اس سے کیا فائدہ۔ ایک چیز کے متعلق یہ صاف طور پر واضح کر دینا زیادہ مناسب ہے کہ اسے نہیں جاری کیا جا رہا۔ تاکہ لوگ غلط توقعات چھوڑ دیں۔

ابھی ابھی اردو کی ووٹر لسٹوں کی اشاعت کا مسئلہ سامنے آیا۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ اردو پنجاب کی عوامی زبان ہے یہاں اردو زبان کو جو رواج حاصل ہے۔ وہ نہ پنجابی کو ہے نہ ہندی کو۔ اس لئے پنجاب میں ووٹر لسٹیں اردو میں شائع کی جائیں۔ پنجاب کے الیکٹورل ڈیپارٹمنٹ نے یہ تجویز دستر کو بھیجی اور وہاں سے صاف انکار کر دیا گیا۔ اور ہم مطالبہ کرنے والے اپنا سا منہ لیکر بیٹھ گئے۔ تو بہتر یہی ہے کہ جب ایک چیز منظور نہیں ہے تو اس سے انکار کر دیا جائے۔ اردو کے پاس کوئی طاقت نہیں کہ وہ اپنے مطالبات کو اس کے ذریعہ منوا سکے۔ ورنہ انصاف تو یہ تھا کہ ووٹر لسٹیں دو زبانوں میں شائع کرنے کے بجائے صرف اردو میں شائع کر دی جاتیں۔ اس میں یکسانیت بھی تھی کفایت بھی تھی۔ اور ایک قومی اتحاد و یک جہتی کی علامت ہوتی۔

آج صوبہ میں اردو کی تعلیم کے مسئلہ کو بہت شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور اس بات کی امیدیں لگی ہوئی ہیں۔ کہ اردو کی تعلیم کی اہمیت کو حکومت بھی سمجھے گی اور اس کا مناسب انتظام کرے گی۔ ہماری خواہش ہے کہ حکومت عوام کی اس مانگ کو محسوس کرے۔ اور اس کا مناسب انتظام کرے۔ تاکہ عوام کا ایک بڑا مطالبہ مکمل ہو سکے۔

(ہفت روزہ میور گزٹ گوڑگانوں)

ضروری گذارش

براہ مہربانی انجمن سے متعلق جملہ خط و کتابت اور ارسالِ زر

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ

کے پتے پر فرمایئے

مخدوم محی الدین

لختِ جگر

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنویں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
کبھی چاندنی رات کا گیت بن کر
کبھی گھپ اندھیرے کی بیکل ہنسی بن کے
پیچھا کرے گی
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
وہ آواز
ناخواستہ، طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کی ہادی بنی
پھر خدا بن گئی
کوئی ماں
کئی سال پہلے
زمانے کے ڈر سے
سرِ رہگذر
اپنا لختِ جگر چھوڑ آئی
وہ ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن
سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انساں کا ہادی بنا
پھر خدا بن گیا

محمد علوی

شکست

دیواریں، دروازے، دریچے گم سم ہیں
باتیں کرتے، بولتے کمرے گم سم ہیں
ہنستی، شور مچاتی گلیاں چپ چپ ہیں
روز چہکنے والی چڑیاں چپ چپ ہیں
پاس پڑوسی ملنے آنا بھول گئے
برتن آپس میں ٹکرانا بھول گئے
الماری نے آہیں بھرنا چھوڑ دیا
صندوقوں نے شکوہ کرنا چھوڑ دیا
مٹھو "بی بی روٹی دو" کہتا ہی نہیں
سونی سیج پہ دل بس میں رہتا ہی نہیں
"سنگر" کی آواز کو کان ترستے ہیں
گھر میں جیسے سب گونگے ہی بستے ہیں
تم کیا بچھڑے سمے سہانے بیت گئے
لوٹ آؤ میں ہارا تو تم جیت گئے

وحید اختر — سورج کی تلاش

بہت حسیں ہے طلوعِ سحر کی جلوہ گری
شعاعِ نور سے ہے زخمِ شب کی بخیہ گری
گرہ کشائیِ ظلمت، شگفتنِ خورشید
وہ کیا کریں، نہیں تقدیر جن کی دولتِ دید
جو روز سوتے ہیں آنکھوں میں لے کے حسرتِ خواب
فراخ دستی میں ہوتی ہے جن کی عمر خراب
یہ خود یہ مان بھی لیں، ہے ہر ایک شب کی سحر
گر اندھیروں میں بھٹکی جو شب گزیدہ نظر
تو چارہ سازیِ فطرت پہ حرف آئے گا
نگاہ و دل کی شرافت پہ حرف آئے گا

٥

اگر ہے پھر بھی یہ اصرار پیمبر سے خاص
کہ ہر سحر ہے نئی زندگی کا نذرانہ
وہ جن کی آنکھ کھلی تھی، ہیں وہ دانستہ
سحر کو مان بھی لیں تو کرم خدا نہ سہے
تو پھر دکھائیں کسے دل ہے کتنے داغ لئے
تلاش کرتے ہیں سورج کو ہم چراغ لئے

شہریار

ہم چلے آئے کدھر

وہ اجلا دن، وہ اجلا ہر اک شام
چشمِ امید چھلکنے لگی، بھرنے لگے جام
آہٹیں سایوں سے، دل درد کے دامن سے
ہوا محوِ کلام
نکہتِ زلفِ شب و روز وہ مہ و سالِ گذشتہ کی صدا
راہِ تنہائی پہ آہستہ خرام
وصل یک لمحہ مگر ہجر دوام
وہ نہ آیا لبِ بام

٥

وہ بجھا داغ، وہ شعلہ ہوا سرد
وہ درِ خواب ہوا، ختم ہوئی شورشِ درد
ہر طرف نیند کی گرد

٥

دستکیں دینے لگی بادِ سحر
نالۂ شب کو ملا بابِ اثر
تشنۂ زیست سے سرشار ہوا دیدۂ تر
ہر گلی کوچہ، ہر اک موڑ، ہر اک راہ گذر
مدح خوانِ طربِ جشنِ نجات
دامنِ دہر رنگ کا سیلاب مگر
بے ثباتی کا ثبات
ہم چلے آئے کدھر

انجمن کا خبر نامہ

اردو لائبریری انجمن اصلاح استھانواں

پٹنہ، ۱۸ اکتوبر۔ انجمن اصلاح استھانواں کے زیر اہتمام اردو لائبریری انجمن الفلاح کا سالانہ جلسہ جناب مہدی حسن صاحب وکیل بہار شریف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جلسہ کا افتتاح جناب مولوی فصیح احمد صاحب نے تلاوت کلام پاک (قرآن شریف) سے کیا اور نجم استھانوی نے سپاسنامہ پیش کیا۔ شمس الہدیٰ استھانوی سکریٹری انجمن الفلاح استھانواں پٹنہ نے سکریٹری کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اور جناب سید مہدی حسن صاحب وکیل بہار شریف نے نہایت مدلل اور مفصل تقریر اردو زبان کی حمایت میں کی۔ آپ نے اردو کو ہندوستان ہی کی زبان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ کلچر کی نشانی بتایا اور اس سلسلے میں اردو کے مرحوم اور زندہ بیسیوں ہندو ادیبوں اور شاعروں کا نام پیش کیا۔ پھر مشتاق احمد استھانوی نے تقریر کی۔ موصوف نے دوران تقریر میں فرمایا کہ استھانواں یوں نہیں کہ یہ تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے اور استھانواں صوبہ بہار کی ان چند ممتاز بستیوں میں سے ہے جن کی وجہ سے بہار کا نام روشن ہے۔ قصبوں میں پہلا استھانواں ہے جہاں بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئیں۔

آپ نے بتایا کہ پٹنہ سے ۱۸۵۹ء میں دیکلی انگلش انڈین کرانیکل بہار ہیرالڈ شائع ہوتا تھا اور اس کا اردو ترجمہ یعنی اردو اخبار "اردو انڈین کرانیکل" بھی چھپتا تھا۔ دونوں اخبار کے ایڈیٹر سید الغنی استھانوی تھے۔ اور یہ اخبار موصوف ہی کی ملکیت تھی۔ یہ مواد ڈاکٹر اختر اورینوی کی مشہور کتاب "بہار میں اردو ادب کا ارتقا" میں موجود ہے۔ اور صوبہ بہار کا مشہور اخبار "اپنچ بانکی پور پٹنہ" پٹنہ سے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۰ء تک نکلتا رہا۔ اپنچ کے ایڈیٹر تقریباً ۵ برس تک استھانواں کے سید رحیم الدین استھانوی تھے۔ اور اپنے مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے مشتاق احمد استھانوی نے کہا کہ جناب زوار حسین وزیر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بہار پولیس ابو طالب علی کے زمانہ بچپن سے اس وطن کے خادم ہیں ایک جفاکش اور مخلص کارکن ہیں۔ بیمار بھتیجے کے زمانے میں بھی موصوف نے ملک و قوم کی خدمت کے لئے کوئی وقت دیا۔ اور جناب زوار صاحب سیوان ضلع چھپرہ کے ایک پختہ مغز پختہ کار، قابل اور مشہور و معروف وکیل تھے۔ اور اب اس وقت بہار کے ایک بیدار مغز سیاست داں ہیں۔

آخر میں جناب زوار حسین صاحب نے نہایت پرمغز اور بصیرت افروز تقریر کی۔ جس میں ہندی اور اردو کی وکالت کی اور مسلمانوں کو اردو کے ساتھ ہندی پڑھنے کی بھی ترغیب دی۔ اور اردو زبان کو قائم رکھنے کے سلسلہ میں قیمتی مشورے دئے۔ موصوف نے دو سو کا وظیفہ روپے انجمن کو عطا کرنے کا اعلان فرمایا اور مزید روپے مستقبل میں دینے کا بھی وعدہ فرمایا۔

دوسری نشست میں جناب ایوب صاحب وکیل پٹنہ کی زیر صدارت

مشاعرہ ہوا۔ اور ابو ظفر وکانوی نے سپاسنامہ پڑھا۔ مشاعرہ میں غضنفر نواب بخش، حکیم عاجز، وفا ملک پوری، شاہ علی شطاری، گیلانی عظیم آبادی، وقار عظیم آبادی شریک ہوئے۔ مندرجہ بالا شعراء کی وجہ سے مشاعرہ میں عوام و خواص نے دلچسپی لی اور مشاعرہ بھی کامیاب ہوا۔ (سکریٹری)

اہم اعلانات اقلیتی زبانوں میں بھی شائع کئے جائیں

بھوپال، ۱۸ نومبر

پتہ چلا ہے کہ مدھیہ پردیش سرکار نے اقلیتی زبانوں کے سرکاری استعمال کے سلسلہ میں بعض مشوروں پر غور کرتے ہوئے ریاست کے کلکٹروں کو ایک یادداشت ارسال کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اطلاع نامے اعلانات، اشتہارات، جو عوام کے لئے ہوں یا ایک مخصوص طبقہ کے لئے ہوں، انتخابات کی ابتدائی و مختتم فہرستیں، قواعد و ضوابط، مخصوص قانون اور احکامات وغیرہ سرکاری زبان ہندی کے علاوہ اقلیتی زبانوں میں بھی مشتہر کئے جائیں۔

اس یادداشت میں اقلیتی زبان ایک طبقہ کی مادری زبان مانی گئی ہے جس کے بولنے والے کسی ضلع، تحصیل یا قصبہ میں مجموعی آبادی کا کم از کم ۱۵ فیصدی ہوں۔ لیکن اس کے اطلاق کا انحصار ضرورت اور فائدہ پر ہے۔ اور اس کا فیصلہ ضلع، تحصیل، قصبہ کا آفیسر یا اعلان جاری کرنے والا ادارہ کرے گا۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق مرہٹی، اردو، اوڑیہ کو اقلیتی زبانوں کا درجہ دیا گیا ہے۔

اردو کے علاقے

شہر، تحصیل اور قصبات۔

سیہور	آبادی ۲۱ فیصدی	برہان پور	آبادی ۱۴ر۴۰ فیصدی
سیونی	″ ۱۵ر۱۲ ″	بھوپال	″ ۵۵ ″
کھنڈوہ	″ ۱۲ر۹۰ ″	سیہور (تحصیل) آشٹہ	″ ۲۴ر۳۳ ″

بھوپال میں اردو تعلیمی بورڈ کا قیام

بھوپال اردو کا بہت بڑا مرکز ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک افسوس کا مقام تھا کہ بھوپال میں ایک بھی اردو پرائمری اسکول نہ تھا۔ نیشنل اردو پرائمری اسکول ایک پرائیویٹ اسکول ہے جسے قائم ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ ایسے تقریباً ۲۰ اسکولوں کی گنجائش ہے۔ اس چیز کو محسوس کرتے ہوئے نیز ثانوی جماعتوں اور کالجوں میں اردو ذریعہ تعلیم یا بطور مضمون کی سہولتیں بہم پہنچانے کے خیال سے کے پیش نظر ایک جلسہ ۶ نومبر ۱۹۶۶ء کی شب میں زیر صدارت جناب ڈاکٹر علی شاہ صاحب نیشنل اردو پرائمری اسکول میں منعقد ہوا۔ جلسہ میں شہر کے مختلف محلوں سے تعلیمی اداروں و مکتبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات نے شرکت فرمائی۔

جناب صادق حسین صدیقی کنوینر نے اردو تعلیمی بورڈ کی قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ جناب محمد عثمان صاحب ناظم نیشنل اردو پرائمری اسکول نے تائید کی۔ جناب مقصود احمد کی (بلاسپوری) سلیمان آرزو صاحب اور محمد اسلم صاحب (ایڈیٹر روزنامہ دعوت دہلی) نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ایک عارضی کمیٹی بنادی گئی جو اردو تعلیمی بورڈ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرے گی۔

محمود الحسینی صاحب ایڈیٹر روزنامہ ندیم بھوپال۔ ڈاکٹر ظفر علی شاہ صاحب۔ عبدالاحد خاں تخلص مدیر بھوپال ٹریبیون۔ صادق حسین صدیقی صاحب۔ عظمت صاحب صدر نیشنل اردو پرائمری اسکول۔ محمد عثمان صاحب ناظم اعلیٰ۔ سلیمان آرزو صاحب۔ حامد حسن شاد صاحب۔

(نامہ نگار)

موجودہ حالات میں ادب کا فریضہ

۱۰ نومبر بوقت چھ بجے شب بمقام اردو لائبریری زیر اہتمام انجمن ترقی اردو اورنگ آباد گیا زیر صدارت جناب سید نظام الدین صاحب قادری ایک ادبی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں جناب سید عبدالمغنی صاحب (شعبہ انگریزی پٹنہ کالج) نے "موجودہ حالات میں اردو ادب کا فریضہ" کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے موجودہ قومی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ لیا۔ انہوں نے بتایا کہ قومی انتشار اور بین الاقوامی خطرۂ جنگ وہ بنیادی مسئلے ہیں جن کے اسباب و نتائج کے طور پر بے شمار الجھنیں ہیں۔ ان تمام مسائل کی مشترک تہہ مادیت کا انحصار مفاد پرستی ہے۔ دراصل انسانی تہذیب کا ارتقا مشینی تمدن کے برابر نہیں ہوا۔ سائنسی تمدن کے مقابلے میں انسانی تہذیب کی اس پسماندگی کے باعث معاشرے سے اخلاق، ضمیر اور کردار کی وہ روحانی قدریں غائب یا کمزور ہو گئی ہیں جو انسانیت، امن، اتحاد اور شرافت کی ضامن ہیں۔

ان حالات کے تحت اردو ادب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی مخصوص لسانی تابش اور ادبی کردار سے کام لیتے ہوئے موجودہ مسائل کی جانب تعمیری توجہ دے۔ اس مقصد کے لئے اردو ادب کو مغربی مادیت کے "سلام" کے جواب میں مشرقی روحانیت کا "پیام" اپنی تمام اصناف کے ذریعہ دینا ہوگا۔ خالص انسانیت کے آفاقی تصور کو رائج اور مؤثر بنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ انسان کو خدا کی وسیع کائنات میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے منوانا ہوگا۔ وسیع النظری اور بھائی چارگی کے تصورات کو محکم کرنا ہوگا۔ الغرض آدمی کو نصب العین تقویٰ، ہمدردی اور ایثار پیشگی ثابت کرنا ہوگا۔

اردو ادب میں اس اہم فرض سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت کہاں تک ہے اس کا اندازہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے آفاقی کلام سے بہ آسانی مل جاتا ہے۔

پروفیسر موصوف کی تقریر کے بعد صدر جلسہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ یہ ادبی جلسہ آٹھ بجے شب میں برخاست ہوا۔

[illegible]
(سکریٹری انجمن ترقی اردو [illegible])

یوم مومن

۱۲ نومبر ۱۹۶۶ء بوقت ساڑھے چھ بجے شام [illegible] ایسوسی ایشن رجسٹرڈ کرنول کی جانب سے اردو کے مشہور شاعر مومن کی یاد میں ایک سمپوزیم رکھا گیا۔ جلسے کی صدارت مولوی سید غضنفر علی صاحب زیدی لکچرار عثمانیہ کالج کرنول نے فرمائی۔ جلسے کے شروع میں نائب صدر ایسوسی ایشن جناب یوسف شکیل نے خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ ایسوسی ایشن کی طرف سے یہ پہلا سمپوزیم ہے۔ جو اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد خواجہ محی الدین نے بعنوان "مومن کی شاعری" جناب یوسف شکیل نے بعنوان "مومن ایک صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے" اور جناب سید خواجہ حسینی صاحب نے بعنوان "مومن کا تغزل" مقالات پڑھے جن کی سامعین نے بہت تعریف کی۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے ایسوسی ایشن کے کارناموں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس قسم کے جلسے ادب کی ترقی کا بہتر ذریعہ بن سکتے ہیں اور نوجوانوں میں ادب کا ذوق بڑھاتے ہیں۔

جلسے میں شہر کرنول کے معزز لوگ شامل تھے۔ آخر کو سکریٹری ایسوسی ایشن کے شکریہ کے ساتھ جلسہ اختتام کو پہنچا۔

سکریٹری
(سلطان محی الدین)

انجمن ترقی اردو ناگپور کا ایک جلسہ

انجمن ترقی اردو شہر شاخ ناگپور کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ دیوالی کے موقع پر بمقام ہندی موربھون سیتابلڈی ناگپور مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۶۶ء بوقت ساڑھے چھ بجے شام منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت "روزنامہ ہتواد ناگپور" کے مدیر اعلیٰ جناب اے۔ ڈی۔ مانی نے کی۔ یہ جلسہ شہر ناگپور میں اپنی نوعیت کا واحد تھا۔ جس میں ہر مذہب و زبان کے لوگ شریک تھے۔ جناب مانی نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ آپس میں یکجہتی قائم کرنا ہو تو اردو زبان کو سیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں مختلف زبانوں کی آمیزش ہے۔ بعد ازاں ہمارے پروگرام کے مطابق جناب نظیر صاحب نے ایک نظم بعنوان دیوالی پیش کی۔ جسے کافی پسند کیا گیا۔ اس کے بعد جناب فرید خاں صاحب نے "اردو زبان اور انجمن ترقی اردو" پر ایک مختصر سا مقالہ پیش کیا۔ جس میں انہوں نے اردو زبان کی تاریخ کا خاکہ پیش کیا۔ پروفیسر نائیک صاحب نے اپنی جوشیلی تقریر میں اردو زبان کے

بیکنے پر کافی زور دیا تاکہ آپس میں اتحاد و اتفاق قائم رہ سکے۔ اس جلسے میں پنڈت پریاگ شکلا بھی موجود تھے جنہوں نے یہ بتایا کہ اردو زبان میں وہ خوبی ہے جس سے کہ باہمی اتفاق قائم رہ سکتا ہے۔ آخری تقریر جناب عبدالجلیل عرشی صاحب نے کی اور بہیں اس بات سے آگاہ کیا کہ اردو زبان کسی قوم یا مذہب کی نہیں بلکہ ایک عالمگیر زبان ہے اور جس کا دائرہ ادب کافی وسیع ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے اس زبان کی ساخت پر بھی روشنی ڈالی۔ عرشی صاحب کی تقریر کے اختتام کے چند دقیق بعد آپ ہی کی صدارت میں ایک مشاعرے کا آغاز کیا گیا۔ جس میں اردو ہندی مراٹھی اور گجراتی کے شعراء نے شرکت فرماکر اردو زبان کو تقویت بخشی اور مشاعرے وہ تھی لطیفہ جس سے اردو زبان کو کافی ترقی ہوتی رہی اور ہوتی رہے گی۔ مشاعرے میں اہل سخن حضرات کا ایک ہجوم تھا اور انہوں نے بہت ہی سکون اور خاموشی کے ساتھ شعر و شاعری سنا۔ شرکت کرنے والے شعراء کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:"

جلیل عرشی صاحب، مجید ناگپوری، پنڈت سوز ہوشیارپوری عاصم زندھیری، وقار صدیقی لکھنوی، ڈاکٹر زندھیر، پروفیسر منشا، شوکت جعفری، سوز خضروی کاظمی، فرید تنویر، ناظم انصاری، نظیر ناگپوری، شاہد کبیر، شاطر حکیمی اور پیارے صاحب ضیاء،

محمد جلیل

(معتمد نشر و اشاعت) ناگپور

بزم جگر ترچراپلی

۔۔۔ نومبر ۱۹۶۱ء شب میں ۹ بجے بزم جگر کے زیر اہتمام دوسرا ماہانہ مشاعرہ بمقام قومی خدمت گھر چوک ترچراپلی جناب احمد بادشاہ، جمال محمد کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حمید، ذکی زیبائی، انور شاد، باقی، نیاز، خورشید اور اختر نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ جناب احمد حسین جنرل سکریٹری نے سامعین کا اظہار تشکر کرتے ہوئے ماہ جنوری ۱۹۶۲ء کے وسط میں بزم جگر کی جانب سے کل ہند مشاعرہ کے پروگرام کا اعلان کیا۔ مشاعرہ شب میں ایک بجے کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

شیخ داؤد فانی

(نائب صدر "بزم جگر")

مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کو خراج تحسین

حیدرآباد۔ ۲۰ نومبر۔ اردو ہال میں منعقدہ ایک جلسہ میں حیدرآباد کے ممتاز مزاح نگار، شاعر اور ادیب مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت مسٹر ایم نرسنگ راؤ وزیر حکومت مقامی نے کی۔ عصمت میموریل پبلیکیشن کمیٹی کی جانب سے منعقدہ اس جلسہ میں مسٹر کے وی رنگا ریڈی ڈپٹی چیف منسٹر نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ عصمت مرحوم مجسم ظرافت تھے۔ طنز اور ظرافت ان کی وہ خوبی تھی جو عوام کے لئے مسرت اور ہنسی کا سامان فراہم کرتی رہی۔ ادب کی بڑی شخصیتوں کی یاد منانا ایک صحت مند روایت ہے۔ اس سے ہم ان کی خدمات کے صحیح اعتراف کے علاوہ ان کی زندگی سے روشنی بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ اس سے قبل مسٹر رحمت علی معتمد نے خیر مقدمی تقریر کی۔ مسٹر ایم نرسنگ راؤ نے کہا اچھا شاعر ایک مصور کی طرح سماج اور زمانہ کی تصویر پیش کرتا ہے۔ عصمت مرحوم کا کلام بھی ایک آئینہ ہے جس میں سماج اور زمانہ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری گل و بلبل کا قصہ نہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ اچھا مزاح نگار پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ مزاح حضرت عصمت کی سرشت میں داخل ہے۔

مشہور شاعر شاہد صدیقی نے اپنے مضمون میں بتایا کہ حضرت عصمت کے فن اور زندگی میں ہم آہنگی تھی۔ مزاحیہ شاعری ان کے دل کی آواز تھی۔ ان کے کلام میں ایسی بھی چنگاریاں ملتی ہیں جو کبھی کبھی شعلہ بن جاتی ہیں۔ رائے جانکی پرشاد صدر اردو مجلس نے اپنے مضمون میں بتایا کہ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے اس کے بعد ان کا خاندان حیدرآباد چلا آیا۔ چادر گھاٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ ان کا مجموعہ کلام "انوار تبسم" ۲۰ سال قبل شائع ہوا تھا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے ممتاز فن کار مصطفیٰ نے حضرت عصمت کی ایک نظم "وغیرہ" دلچسپ انداز میں سنائی۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے اپنے مضمون میں مرحوم کی شاعری اور نثر پر روشنی ڈالی۔

(نامہ نگار)

اِدھر اُدھر سے

بچوں کی کتابوں کے ۲۸ مصنفوں کو انعام

نئی دہلی ۱۵ر نومبر۔ مرکزی وزارت تعلیم کے سلسلہ میں منعقدہ بچوں کے ادب سے متعلق ساتویں انعامی مقابلہ میں منتخبہ مصنفوں کو ایک ایک ہزار روپے کے سات انعامات اور پانچ پانچ سو روپے کے ۲۱ انعامات تقسیم کئے گئے ہیں۔ ان انعامات کا اعلان وزارت کے ایک پریس نوٹ میں کیا گیا ہے۔

اردو زبان کی جن کتابوں کو انعامات دیئے گئے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ "ہماری آباد دنیا" مصنف شری فصاحت حسین۔ اور "خلا کا سفر" مصنف شری اطہر پرویز۔ یہ دونوں کتابیں سات سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے ہیں۔ ان دونوں کو پانچ پانچ سو روپے کے انعامات ملیں گے۔

ہندی میں کتاب "آواز" مصنف شری کیشو ساگر کو ایک ہزار روپے کا انعام ملا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی کی تین کتابیں جن کو پانچ پانچ سو روپے کے انعامات دیئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے نام ہیں "ہمارے وائیلڈ لائف" مصنف شری راجیشور پرشاد نارائن سنگھ۔ "دنیا کے آشچریہ" مصنف شری دھرپال شاستری۔ اور "اپنا دیش" مصنف شری رام چند تیواری۔ پنجابی میں دو کتابوں کو پانچ پانچ سو روپے کے انعاموں کا اعلان ہوا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ مصنف شری گوربچن سنگھ کھوچیلا مصنف شری آر ایس اہلووالیہ۔ یہ انعامی مقابلے بھارت سرکار کی ایک اسکیم کے تحت منعقد کئے جاتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کے ادب کی حوصلہ افزائی کے لئے موزوں ادب تخلیق ہو سکے بچوں کے ادب سے متعلق کمیٹی کا اجلاس نئی دہلی میں ۱۰ر نومبر کو ہوا تھا جس میں کمیٹی نے یہ بات محسوس کی کہ حالیہ برسوں میں بچوں کے ادب میں کافی بہتری ہوئی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس سال موصول کتابیں معیار پر پوری نہ اترتی تھیں۔ ایک ایک ہزار روپے کے بندرہ انعامات دیئے جا سکتے تھے۔

ایک ہزار روپے کے انعام پانے والے دیگر مصنفوں آسامی میں شری راج شیکھر، بنگالی میں شری من موہن چکرورتی۔ کنڑ میں شری ایم ایل نرسمہم آئنگر، ملیالم میں شری اور دیر منیفورن مراٹھی میں کماری سیٹھنے بر بیچ اور تیلگو میں شری اے وی ایس۔ رماراؤ کے ناموں کا اعلان ہوا ہے۔

اس طرح پانچ سو روپے کا انعام حاصل کرنے والوں میں آسامی میں شری جوگیندر ناتھ سکیا۔ بنگالی میں شرو شری شوبن چکرورتی اور امویہ بھوشن گپتا۔ گجراتی میں سرد شری جے بھاگو بالا بھائی وی ڈیسائی۔ اور مکھن بھائی کالار تھی۔ کنڑ میں شری جے این کملا پور۔ ملیالم میں شری پی کے نارائن۔ مراٹھی میں شری وی وی ایس۔ جے دھکر ۱ اوڑیہ میں شری درگا پرشاد پٹنایک اور پروفیسر ششتار کمار آچاریہ۔ سندھی میں شری فتح چند ایم وسوانی تامل میں سرد شری وی۔ وی گوپال کرشن۔ اور ایس وی دوریسوامی مدلیار اور تلگو میں سری کے نرسمہم اچاری کے نام شامل ہیں۔

پنجابی زبان کے لئے ساٹھ ہزار الفاظ

پٹیالہ ۱۵ر نومبر حکومت پنجاب کے محکمہ لسانیات (لینگوایج ڈیپارٹمنٹ) نے گزشتہ چند سال کے عرصہ میں ۶۰ ہزار پنجابی الفاظ تیار کئے ہیں۔ اکثر الفاظ حکومت کی دفتری اصطلاحات کے بارے میں ہیں۔ ان الفاظ پر مشتمل ایک خاص ڈکشنری تیار کی گئی ہے۔ جو موجودہ مالی سال کے دوران چھاپ دی جائے گی۔

نیپالی زبان میں تاریخ ہند

گنگٹوک ۱۰ر نومبر شعبہ اطلاعات کی طرف سے یہاں سکم بچوں میں تقسیم کرنے کے لئے نیپالی زبان میں تاریخ ہند کی ایک کتاب چھاپی گئی ہے۔ جو ۱۴ر نومبر کو یوم اطفال کے سلسلہ میں تقسیم کی جائے گی۔ شعبہ اطلاعات نے اس سے پہلے مہاتما گاندھی کی سوانح حیات، مہاتما بدھ کے حالات اور چین اور ہندستان کے سرحدی جھگڑے کی روپ ریکھا نیپالی اور تبتی زبان میں چھاپی تھی۔

تان سین میلہ

گوالیار ۱۵ر نومبر۔ مشہور موسیقار تان سین کے عرس کا میلہ جو ہر سال جنوری میں ہوتا ہے اس سال ۸ر دسمبر سے شروع ہو کر ۱۰ر دسمبر کو ختم ہوگا۔

اس موسیقی میلہ کا افتتاح صوبائی گورنر شری ایچ وی پاٹسکر کریں گے۔ مرکزی وزیر اطلاعات شری کیسکر مہمان خصوصی ہوں گے۔

اس میلہ میں شرکت کرنے کے لئے مشہور موسیقار نثار حسین خاں۔ رحیم الدین خاں۔ ولایت حسین خاں۔ مشہور ٹھمری رسولن بائی، بسم اللہ خاں۔ اور دیگر مشہور گلوکار شرکت کریں گے۔

پہلے سیشن میں گوالیار کے میوزک کالج کے طلبا کورس پیش کریں گے۔ اس کے بعد حفیظ خاں۔ داتار۔ اور شری کانت اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ آخری دن رسولن بائی ٹھمری اور دادرا پیش کریں گی۔

ایران کی مشہور و معروف فلسفی کی چار سو سالہ برسی

ملا صدرا ایران کے مشہور و معروف فلسفی گذرے ہیں۔ ایران سوسائٹی کلکتہ کے زیر اہتمام منگل ۱۳ر نومبر کو ۵ بجے شام کے وقت ان کی چار سو سالہ سالگرہ سوسائٹی کی عمارت واقع ۱۲ کیڈ اسٹریٹ (نزد پارک اسٹریٹ) میں منائی گئی۔ ڈاکٹر کالی داس ناگ صاحب ایم اے ڈی لٹ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

طہران یونیورسٹی کے فاضل پروفیسر ڈاکٹر سید حسین نصر صاحب اس جلسہ میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر ایران سے تشریف لائے۔

ہندی میں کلاسیکل کتابوں کا ترجمہ

وارانسی۔ ۱۵ر نومبر وزیر تعلیم اتر پردیش آچاریہ جگل کشور نے کتابوں کے قومی میلے کا افتتاح کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ حکومت اتر پردیش نے کلاسیکل کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرانے کی ایک اسکیم تیار کر لی ہے جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جائیں گی۔

عتیق الغنی

"سپنوں کے دیس میں"

"زمان و مکان کی حدوں سے آزاد فضا میں ایک بیٹھا، عظیم دماغ نے اپنی بیکراں بیداری میں تنوع پیدا کرنے کے لئے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا" ....

——— اس طرح جناب اختر اورینوی "برہما کے اس" عجیب و غریب خواب" کی کہانی بیان کرتے ہیں جس سے کائنات، حیات اور انسان کی تخلیق اور ارتقا عمل میں آیا۔

یہ افسانہ "فی الواقع اختر صاحب کے ایسے ہی ایک سابق افسانے "بال جبریل اور کہکشاں" کی گویا دوسری قسط ہے۔ پہلی قسط پر 'ہماری زبان' میں کچھ عرصہ قبل تبصرہ کر چکا ہوں۔ اسکے بعد یہ دوسری قسط نظر سے گذری تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کو مکمل کر دیا جائے۔

نقشِ ثانی، فنی اعتبار سے، نقشِ اول سے بھی زیادہ ثقیل اور خشک ہے۔ اس لئے اس کو افسانہ تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ حقیقت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جب اس کا تقابل اسی نوعیت کی داستان 'آگ کا دریا' (از قرۃ العین حیدر) سے کیا جائے۔ دونوں ہی میں برہما کے پر پیچ تخیل کی بھول بھلیوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے فرق پھیلنے کی وسعت کے علاوہ، یہ ہے کہ "آگ کا دریا" میں تخیل کو ایک مسلسل قصے، کرداروں، گفتگوؤں، عمل، ردعمل اور پس منظر کے ساتھ ایک لوچ دار زبان کے ذریعہ مجسم کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف "سپنوں کے دیس میں" تخیل کا صرف فکری و تاریخی تجزیہ کچھ افسانوی کچھ ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے برہما کے ذہن کی تشریح تو کسی حد تک ہو جاتی ہے لیکن اس کے سپنوں کا کوئی دیس آباد نہیں ہوتا، جس میں آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں آنکھ مچولی کھیلتی نظر آئیں۔ اختر صاحب کے اس افسانے میں کہانی کا دھندلکا اور رومان کی چاندنی نہیں۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فنکار نے شعوری طور پر افسانے کی ہیئت استعمال کی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کہانی کو اس داستانی فقرے سے شروع کرتا ہے: "سوتا سنسار جاگتا پالنہار" وہ خواب کی کیفیتوں کی منظر کشی بھی بالکل افسانوی انداز میں کرتا ہے۔ وہ اسکی بھی کوشش کرتا ہے کہ اس کی داستان میں ایک قصے کا تسلسل پیدا ہو جائے۔ چنانچہ یہ حقائق ہمیں مجبور کر دیتے ہیں کہ اس کی تخلیق کو فلسفیانہ مضمون نہ سمجھیں۔ لیکن دوسری طرف ہم اس کو افسانہ تسلیم کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہو پاتے ..... یہ صورت حال اردو افسانے کے ارتقا میں ایک عبوری مقام کو پیش کرتی ہے۔ یہاں ایک نیا موڑ نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ اختر اورینوی کی یہ کوشش ایک خاص تجرباتی چیز ثابت ہوتی ہے۔ کہاں تک اور کب تک یہ اردو افسانے کی ایک مستقل روایت بن جائے گی۔ اس کے متعلق پیش گوئی کی بجائے فی الوقت اتنا ہی کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی اس تازہ تجربے کو ایک زریں روایت بننے کا شرف حاصل ہوگا۔ اختر اورینوی کو اس کے بانی کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔

بہر حال "افسانے" میں برہما کا خواب ایک خواب پریشاں کی طرح ظاہر ہوا ہے۔ اس خواب میں تسلسل تو ہے لیکن مربوط نہیں، خواب کے الگ الگ ٹکڑے سے نمودار ہوتے ہیں۔ بعض ٹکڑے کبھی آپس میں ٹکرا بھی جاتے ہیں۔ ان جدا جدا ٹکڑوں کے درمیان صرف ایک ہستی رابطہ ہے' 'جو ہمت میں سب سے اونچا' ہمسایہ آسمان کا ۔ ہمالہ۔ بس ایک ہمالہ ہے جو ابوالہول کی طرح استقلال سے کھڑا ہوا برہما کے خواب ہستی کے نشیب و فراز کو دیکھتا رہتا ہے ——— ممکن ہے' قصے کی تعمیر میں یہ انتشار خواب پریشاں کے کامل ابلاغ کے لئے ایک شعوری ہیئت کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔

"سپنوں کے دیس میں" 'بال جبریل اور کہکشاں' سے ذرا مختلف ہے گرچہ دونوں کا مقصد، تجزیہ اور محرک ایک ہی ہے، لیکن نقش اول سے نقش ثانی تک فنکار کے ذہن و فکر میں کچھ تبدیلی یا ترقی ہوئی ہے۔ پہلے افسانے میں مواد کے لئے فلسفیانہ افکار پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے میں مذہبی حقائق کو پیش نظر رکھا گیا ہے' وید، انجیل اور قرآن سرچشمۂ تخیل ہیں۔ مرکز حوالہ کا یہ تغیر ذہنی پختگی کی دلیل ہے اور فنکار کی سلیم طبیعت کا ثبوت۔ اس سے اسکے وسیع مطالعے، گہری نظر اور خلوص نیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن مذہب اپنی مسلّمہ استقامت کے باوجود فلسفے سے بھی زیادہ نازک چیز ہے اسی لئے بعض اوقات دین اور وہم کے درمیان تمیز مشکل ہو جاتی ہے حقیقت کے خرافات میں کھو جانے کا اندیشہ شدید ہے۔ اس لئے افسانہ طرازی کے لئے اساطیر گرچہ بہت رنگین اور دلچسپ ہیں لیکن حقائق کی وضاحت میں ان کی خطرناکی آزمودہ ہے۔ چنانچہ زیر نظر افسانے میں بعض مواد کی نوعیت کے باعث قدرتی طور پر کچھ باتیں مبہم سی ہو جاتی ہیں۔ نتیجۃً اسرار منکشف ہونے کی بجائے اور بھی مرموز ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت واقعہ افسانہ نگار کے اس بیان مقصود کے منافی ہے جو اس نے "سپنوں کے دیس میں" کی تمہید کے طور پر پیش کیا ہے:

"میں ایک کہانی کہنے لگا ہوں۔ کہانی اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کہانی کہنے سے اپنے آپ اور اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یا کم از کم مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھندلکے صاف ہو رہے ہیں ...."

افسانہ ختم کرنے کے بعد دھندلکے صاف نہیں ہوتے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ ذہن میں ایک عجیب پُر اسرار کیفیت محسوس ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہانی کے عروج پر ہم وہاں پہنچ گئے ہوں جہاں آگے

اگر یک سر موئے برتر پرم ● فروغ تجلی بسوزد پرم

میرے خیال میں یہ عروج بالکل فطری اور منطقی ہے۔ ابتدا اور ارتقا کی نوعیت کے اعتبار سے یہی انتہا ممکن اور موزوں ہو سکتی تھی۔ اس معاملے میں فن کامیاب ہے۔ فکر کی رسائی کے متعلق یہ شعر ناطق ہے:-

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے' نہ انتہا معلوم

چنانچہ اصل قابل غور چیز حکایت ہستی ہے' جناب اختر اورینوی کا

شغف اور اس کے بیان کی جرأت ہے۔ یہ بات کتنی ہی اندیشناک ہو، اُردو افسانے کے زر، زمین، زن، کے مثلث سے بہت ممتاز ہے۔ یہ محض فکری بلندی نہیں، فنی سنجیدگی کا وہ ثبوت ہے جس کے شبہات بھی ہمارے جدید افسانے میں ڈھونڈے نہیں ملتے، الا ماشاء اللہ!

جناب اختر اورینوی نے "دیوانے کے خواب" کی دو تعبیریں "بال جبریل اور کھلیاں" اور "سپنوں کے دیس میں"۔ پیش کر کے اُردو افسانے میں ایک اہم عنصر کو داخل کیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ اُردو ادب کی تاریخ میں محفوظ رہے گا۔

ہمارے افسانوی ادب کے افق میں یہ توسیع دراصل خود اختر صاحب کے فنی ارتقا کی ایک منزل ہے۔ اُردو افسانہ نگاروں کی صف اول میں اُن کی انفرادیت ابتدا ہی سے اس انتہا کی غماز ہے۔ اختر صاحب نے عموماً اپنے افسانوں میں عارضی مسائل کی بجائے مستقل انسانی قدروں کو ابھارا ہے۔ وہ رومان کی سستی دلچسپی پر اکتفا نہیں کرتے۔ ان کے یہاں دلچسپ واقعات کی تہ میں ہمیشہ کچھ گہرے خیالات پائے گئے ہیں۔ وہ اکثر افسانے کو رزمیہ (ایپک) یا المیہ (ٹریجڈی) کی بلندی تک لے جاتے ہیں۔ چنانچہ تمثیلی کہانیوں سے فلسفیانہ یا الاہیاتی "تمثیل" تک ایک مربوط فکری و نیز فنی ارتقا ہے۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی، اور عصمت کے مقابلے میں، ان چاروں کی انفرادی عظمت کے باوجود، اختر اورینوی کا امتیاز ان کا یہی تفکر ہے۔

اختر صاحب کے اسلوب میں "اقبالی" شوکت اسی تفکر کا اشارہ ہے۔ اسلوب کی یہ پُر پیچ قماش "سپنوں کے دیس میں" میں "بال جبریل اور کھلیاں" سے بھی زیادہ پیچیدہ تفکر کی بالیدگی کے سبب ہی ہے۔ یہاں شعر و افسانے کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ چنانچہ افسانے کی مخصوص فضا واقعات کی بجائے معنی خیز لفظوں کی خیال انگیز ترکیبوں سے بروئے کار آتی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسلوب غیر افسانوی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچنا چاہیے کہ حکایت ہستی کی گراں باری کے لئے سبک ساحل آخر کیسے لگا جائے؟ فی الواقع یہاں موضوع کی طرح اسلوب بھی فن کا ایک مسئلہ ہی بن جاتا ہے۔ گرچہ اختر صاحب کے اپنے فن میں یہ اسلوب روایت بن چکا ہے، لیکن عام سطح پر اسے ابھی تجرباتی مرحلے سے گذرنا ہے۔ گرچہ اسلوب کی یہ قماش ایک حد تک کرشن چندر کے یہاں بھی غالب ہے لیکن منٹو، بیدی اور عصمت نے اپنی سادہ بیانی سے پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کو ایسا رجھایا ہے کہ اس وقت ہمارے افسانے میں ان ہی کی روایت مقبول و مستحکم ہے۔ اس معاملے میں وہ ہیں بھی روایتی، اس معنی میں کہ انھوں نے اُردو افسانے کے آدم پریم چند کے طرز کو سنبھالا اور بڑھایا ہے۔

بقیہ

ہندوستانی ادب میں نئی سمتیں

گھٹیا قلموں کے لئے، اپنی افتادِ طبع کے برعکس مکالمے لکھنے لگے اور کچھ ہی دن میں حقیقی ادب کے لئے ناکارہ ہو کر رہ گئے۔

اس صورت حال میں ہندوستانی ادیب کو مرکز اور ریاستوں میں قومی حکومت سے مختلف شکلوں میں سرپرستی ملنے لگی۔ اور یہ سرپرستی ایسے ملک کے لئے ضروری بھی تھی جہاں اجنبی حکام نے مقامی کلچر کے فطری نشوونما کو قصداً نقصان پہنچنے دیا ہو، اس سے نفرت کی ہو اور جہاں کے باشندے ایک طویل اور کڑی سیاسی جدوجہد میں برسوں مصروف رہے ہوں۔ ساہتیہ اکیڈمی اور نیشنل اکیڈمی آف لیٹرز کی تشکیل نے فی الواقع ہندوستان کی تمام زبانوں کی اہمیت اور مرتبے کو صحیح طور پر پہچانا۔ اور عالمی ادب کے جواہر پارے، اکیڈمی کے ذمہ دار اصحاب کی نگرانی میں، دیسی زبانوں میں منتقل ہونے لگے۔ اس اقدام کے اثرات ہمارے ادبیات پر اچھے پڑتے نظر آتے ہیں۔

لیکن ریاستوں میں جو سرپرستی ہمارے ادیبوں کو ملی اور جو مفید بھی ثابت ہوئی وہ درسی کتابوں اور اشتہاری ادب کی تیاری تھی جب تک ریاستی رہنمائی جہالت اور کٹرپن میں ڈوبی ہوئی ہے، قدامت پسند اور ہٹ دھرم ہے تب تک قلم کا دھنی اپنی نطانت و فراست کی سچائی کو نئے حاکم کی ضرورتوں کے لئے قربان کرتا رہے گا ——— نیا حاکم جو آزاد حرف، اور آزاد تر فکر سے ڈرتا ہے۔ ادب، جو زندگی کی تنقید ہے، سماج کی قدروں کا بدلنے والا ہے، اس لئے کہ یہ سوال کرتا ہے مسلّمہ روایات اور جامد معاشرت کو دفن کر دیتا ہے۔ اسے ابھی تک اس نئے کٹرپن کو توڑنے کا موقع نہیں ملا ہے جو نئے سرپرستوں کے پیچھے بندھا چلا آ رہا ہے۔

"شیطان ہمارا پیچھا کر رہا ہے!" جواہر لعل نہرو نے حال ہی میں کہا تھا۔ اور اب جو کچھ ہم امید کر سکتے ہیں، یہ ہے کہ زندگی میں مُردہ عناصر اس تنبیہ پر کان دھریں گے۔

تمام پُرقوت ادبیات اپنی روایات، اپنے اسالیب ڈھال لیتے ہیں۔ اور ان کے دھاروں کو دنیا کی کوئی بھی طاقت سیاسی یا غیر سیاسی نہیں موڑ سکتی، بجز خود انسان کی اُس فہم و فراست کے جو سحرکارانہ روحِ عصر سے مل جاتی ہے۔ اس طرح اچھے ادب کا بھی کوئی فارمولا نہیں ہے سوائے اعلیٰ درجے کی انفرادی صلاحیتوں کے۔ زندگی کی جبلّتوں سے لبالب، ایسے فرد کے قلم سے نکلی ہوئی کتاب کبھی نہیں مر سکتی، خواہ اس کا لکھنے والا کوئی گمنام کاتب ہی کیوں نہ ہو۔ بالکل اسی طرح متعصب نقاد کسی گھٹیا کتاب کو آج تک کلاسک نہیں بنا سکے۔

"میں وہ لفظ ہوں جو تمام چیزوں میں کھیلتا اور رقص کرتا رہا!" مسیح کا ایک جدید نغمہ ہے۔ اور ہر شخص اس تکلیف و تلاش سے باخبر ہے جس نے غناطسی آیات کو جنم دیا! لیکن کچھ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسیح صلیب پر چڑھا دیئے گئے قبل اس کے کہ اُن کی سچائی پھیل سکے۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا

تبصرہ

خلیل الرحمٰن اعظمی

اُردو میں قصیدہ نگاری

مصنف :- ابو محمد سحر
ناشر :- خیابان، سبزی منڈی الہ آباد
قیمت :- ڈھائی روپے

قصیدہ نگاری کے فن اور اردو قصائد کی تاریخی و ادبی حیثیت پر تنقیدی مواد بہت کم ملتا ہے۔ اب سے کوئی عرصہ پہلے جلال الدین احمد جعفری مرحوم نے "تاریخ قصائد اردو" کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھ کر الہ آباد سے شائع کی تھی لیکن یہ کتاب خالص درسی نوعیت کی تھی اور نقد و تبصرہ کا انداز بھی پرانا تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ الہ آباد ہی سے اس موضوع پر ایک اور کتاب شائع ہوئی ہے جو کئی اعتبار سے جعفری صاحب مرحوم کی کتاب پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ابو محمد سحر صاحب نے صنف قصیدہ پر لکھتے ہوئے اس کے سماجی پس منظر کا خیال رکھا ہے۔ دوسرے تحقیقی اور معلوماتی مواد پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ تنقیدی اصولوں کی روشنی میں مشہور شعراء کے قصائد اور ان کے فن قصیدہ نگاری کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تجزیے و تبصرے کا انداز بیان واضح اور شگفتہ ہے۔ تحقیق اور تنقید کا ایک خوشگوار امتزاج ان کے یہاں موجود ہے جو ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ اس کتاب میں گمنام اور کمیاب قصیدوں کی تلاش و تحقیق زیادہ نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ مشہور اور اہم قصیدہ نگاروں کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ اور یہ ایک لحاظ سے ضروری بھی تھا۔ کیونکہ اس قسم کی چھان بین اور فہرست سازی کا کام کئی جگہوں پر ہو چکا ہے اور اس کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جو اپنی جگہ پر مفید ہے۔ لیکن اردو کے اہم قصیدہ نگاروں کے فن پر نئے انداز سے لکھنے کی بہت ضرورت تھی۔ اور اس کتاب کے مصنف نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ ویسے اہل تحقیق کی ضیافت طبع کا سامان بھی کہیں کہیں موجود ہے۔ مثلاً یہ دریافت کہ تعداد اشعار کے لحاظ سے اردو کا طویل ترین قصیدہ کون سا ہے۔ اور وہ کس شاعر کی تصنیف ہے؟ زیر نظر کتاب کے مصنف کے خیال میں اردو کا طویل ترین قصیدہ سودا کے شاگرد مصلح الدین کا ہے جو مصحفی کی ہجو میں لکھا گیا ہے۔ یہ قصیدہ آٹھ سو اڑتالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ "عربی اور فارسی میں بھی شاید ہی اتنا طویل قصیدہ لکھا گیا ہو" حاشیے پر یہ اطلاع بھی موجود ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ طویل ترین قصیدہ مصلح الدین کا نہیں بلکہ سودا کے ایک اور شاگرد احسن کا ہے۔ بہرحال
"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔"